مباحثہ ومکالمہ

سراج الدین امجد *

دیوبندوبریلی: اختلافات سے مشترکات تک

امت مسلمہ آج جن گوناگوں مسائل کا شکار ہے ان میں ایک فرقہ واریت بھی ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر اس کی تباہ کاریوں پر نگاہ دوڑائی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آج کے دور میں یہ الحاد اور بے دینی سے بھی بڑا فتنہ اور عفریت ہے۔ آج اگر ملت اسلامیہ کا بدن لہولہان ہے تو جہاں اغیار کی ریشہ دوانیاں ہیں، وہیں اپنوں کی کارستانیاں بھی کم نہیں۔ کیا یہ تلخ حقیقت نہیں کہ آج شرق سے غرب تک جہاں بھی مسلمان پس رہے ہیں، وہاں عالمی سامراج کے ناپاک عزائم کے ساتھ ساتھ اندرونی خلفشار اور باہمی تنازعات کی شرانگیزی بھی کارفرما ہے۔ گویا خارجی محاذ پر اگر کفرو الحاد کی فتنہ سامانیاں ہیں تو داخلی محاذ پر تکفیری ذہنیت اور فرقہ واریت کی شرانگیزیاں۔ یہ مسائل اس وقت مزید گھمبیر اور اندوہناک معلوم ہوتے ہیں جب بین المذاہب تو کجا، خود اہل سنت کے مکاتب فکر کے اندر بھی مسلکانہ شدت پسندی اور تفسیق وتضلیل کا بازار گرم ہو۔ اگر کہیں باہمی رواداری، یگانگت، اتحاد اور یکجہتی کی فضا قائم کرنے کی کوشش بھی کی جائے تو جلد ہی دیرینہ تعصّبات کی زہرناکی اور قلبی منافرت عود کر آئے۔ اور امن وآشتی اور مسلکانہ رواداری کے سارے دعوے کھوکھلے محسوس ہونے لگیں۔ تو کیا اس دیرینہ بیماری کا علاج اور تدارک کا ساماں ہی نہ کیا جائے؟ نہیں، قطعاً نہیں بلکہ زیادہ قوت، یکسوئی اور تن دہی کے ساتھ اس کی زہرناکیوں کو بجھانے کی ضرورت ہے۔ اس خطے میں جس طرح آج سنی مکتبہ فکر کے دو بڑے گروہ یعنی دیوبند اور بریلی آپس میں دست وگریباں ہیں، اس پر ہر دردمند دل افسردہ اور پریشاں ہے۔

اس باہمی آویزش کی کچھ وجوہ ہیں۔ تاہم اس کے حل کی کوئی کوشش اس تمام صورتِ حال کے معروضی جائزہ اور غیر متعصّبانہ تفہیم کے بغیر شاید ممکن نہ ہو۔ جو لوگ فطرت انسانی میں کارفرما گوناگوں نفسیاتی مہیجات اور تعصّبات کا تجزیہ کرتے رہتے ہیں، وہ اس بات کی برملا تائید کریں گے کہ باہمی نفرت وکدورت کم علمی، بے جا تعصّبات، ناگوارانانیت اور معاملات کا درست تجزیہ نہ ہونے سے ہی پھیلتی ہے۔ پھر دینی اور مذہبی معاملات میں چونکہ اپنے موقف پر اصرار کو تصلب، للٰہیت اور پرہیزگاری کا لبادہ اوڑھا دیا جاتا ہے، لہٰذا معروضی تناظر اور بے لاگ تبصرہ وتحقیق کی نوبت آتی ہے نہ خیال گزرتا ہے۔ اور یوں فکر ونظر کا اختلاف بھیانک مسلکانہ پیکار کا روپ دھار لیتا ہے۔ اس مضموں میں دیوبند اور

amjadsirajuddin@gmail.com

بریلی کی علمی اور فکری آویزش کے پس منظر کا تعارف بھی ہے، طرفین کی جانب سے ایک دوسرے کے رد وخلاف کی وجوہات کا تذکرہ بھی۔ نیز ہر ایک کے جدا ذوقی رنگ اور طرزِ فکر کا بیان بھی۔ آخر میں طرفین کے معتدل فکر علماء کا اجمالی تعارف اور مشترکات کا بیان، تاکہ آنے والے دنوں میں جداگانہ مسلکانہ تشخص کے باوجود دونوں طبقات میں باہمی رواداری اور حسن ظن کی خوشبو بکھرتی رہے۔

دیوبندی بریلوی مناقشہ: بحث مباحثہ سے مناظرہ بازی تک

علماء اہل سنت کے درمیان شرک و بدعت کے مسائل ہوں یا تقدیسِ الوہیت اور عظمتِ رسالت سے متعلقہ ابحاث، یہ تو دیوبند اور بریلی کے مدارس کے قیام سے بھی بہت پہلے کی ہیں۔ مسئلہ امتناعِ نظیر کے حوالے سے شاہ اسماعیل صاحب دہلوی اور علامہ فضل حق خیر آبادی کے درمیان بحث مباحثہ تو مشہور ومعروف ہے۔ خاص دیوبندی وغیر دیوبندی (بریلوی) تنازعہ کے تناظر میں بھی دیکھنا ہو تو ساری بحث اثر ابن عباس کے حوالے سے مولانا احسن نانوتوی کی کتاب سے شروع ہوئی۔ اس کی تائید میں مولانا قاسم نانوتوی نے ۲۲۹۰ھ/۱۸۷۲ء میں تحذیر الناس لکھی۔ اس پر اہل سنت کے حلقوں میں خوب شور اٹھا۔ اور ہندوستان بھر میں علماء نے مخالفت کی۔ بلکہ خود مولانا تھانوی نے کہا ہے کہ جب مولانا نانوتوی نے تحذیر لکھی تو ہندوستان بھر میں کسی نے موافقت نہ کی سوائے مولانا عبدالحئی لکھنوی کے (دیکھیے الافاضات الیومیہ، جلد چہارم)۔ یہ الگ بات کہ مولانا لکھنوی نے بھی بعد میں رسالہ ''ابطالِ اغلاطِ قاسمیہ (۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء)'' کی تائید کر کے پہلے موقف سے رجوع کر لیا۔ یہ رسالہ بھی کسی بریلوی عالم کی کاوش نہ تھی۔ بلکہ شروع میں مخالفت دیگر سنی علماء کی طرف سے سامنے آئی۔ اور وہیں سے بات آگے بڑھی۔

اسی طرح اس دور میں ایک اور تصنیف جو بعد میں علماء دیوبند اور سنی علماء کے مابین وجہ بحث بنی، وہ "انوار ساطعہ" ہے جس کے مصنف مولانا عبدالسمیع رامپوری تو حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلیفہ تھے۔ کوئی بریلوی نسبت نہ تھی۔ بلکہ یہ کتاب آپ نے ۲۰۳۱ھ میں لکھی، جبکہ دار العلوم منظرِ الاسلام بریلی کا قیام ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں عمل میں آیا۔ اس کے رڈ میں براہین قاطعہ ۱۳۰۴ھ میں آئی۔ ان موضوعات پر پہلا بڑا مناظرہ علامہ غلام دستگیر قصوری (خلیفہ حضرت مولانا محی الدین قصوری جو معروف نقشبندی مجددی شیخ یعنی شاہ غلام علی دہلوی کے خلیفہ تھے) اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے درمیان بہاولپور میں ۱۳۰۶ھ میں ہوا۔ مولانا قصوری کی زندگی بھر مولانا احمد رضا خاں بریلوی (م ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) سے ملاقات تک ثابت نہیں، چہ جائیکہ انہیں بریلوی کہا جائے۔ بلکہ زمانی لحاظ سے بھی انہیں مولانا کے والد، مولانا نقی علی خان کا معاصر کہنا زیادہ درست ہوگا۔ گویا علماء دیوبند کے مقابل علمی بحث اور مناظرہ بازی سینوں میں جن دو بڑی قد آور شخصیات نے شروع کی، دونوں کا بریلویت سے کوئی تعلق نہیں، یعنی ایک ان کے اپنے شیخ حضرت مہاجر مکی کے خلیفہ مولانا عبدالسمیع رامپوری اور دوسرے علامہ قصوری۔

گویا یہ عقائد و معمولات کا اختلاف اور مناظرے مولانا احمد رضا بریلوی کے فتاویٰ سے بھی دو دہائیاں پہلے کے ہیں۔ تاہم یہ درست ہے کہ حسام الحرمین (۱۹۰۶ء) نے دیوبندی بریلوی تنازع کو بہت اجاگر کیا اور طرفین کے رویوں

میں شدت آنے لگی۔ تاہم دیوبندی بریلوی تنازع کو سمجھنے کے لیے اس کا تاریخی پس منظر سمجھنا ناگزیر ہے اور اس کے لیے دو کتب کا مطالعہ از حد ضروری ہے اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، یہ دونوں کتابیں کسی بریلوی عالم کی نہیں۔ ایک حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلیفہ اجل کی ہے۔ میری مراد 'انوار ساطعہ' از علامہ عبدالسمیع رامپوری (م ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء) سے ہے، جبکہ دوسری معرکہ آراء تصنیف 'تقدیس الوکیل' علامہ غلام دستگیر قصوری نقشبندی (م ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء) کی ہے جو خواجہ غلام محی الدین قصوری نقشبندی مجددی (خلیفہ شاہ غلام علی دہلوی) کے خلیفہ اور شاگرد تھے۔ لہٰذا ان اکابر کی کتب کا مطالعہ بڑی حد تک اس علمی و فکری پس منظر کو واضح کر دیتا ہے۔ ان دو کے علاوہ اکابر دیوبند کے پیر و مرشد سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (م ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء) کا رسالہ "فیصلہ ہفت مسئلہ" (شائع شدہ ۱۳۱۲ھ) بھی لائق مطالعہ ہے جو دراصل انوار ساطعہ اور براہین قاطعہ کی مباحث کے بعد خود ان کے نامی گرامی خلفاء میں باعث تفریق و تشویق مسائل کا حل ڈھونڈنے کی ایک اہم کاوش تھی۔

مزید حیران کن بات یہ ہے کہ علماء دیوبند کی مویدہ 'براہین قاطعہ' کے مقابل 'انوار ساطعہ' کو بریلوی علماء کی بجائے استاذ الکل مولانا لطف اللہ علی گڑھی (م ۱۳۳۴ھ۔ سید ابوالحسن علی ندوی نے انہیں استاذ الکل لکھا ہے)، مولانا عبدالحق حقانی صاحب تفسیر حقانی (م ۱۳۳۵ھ)، مولانا رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکی (م ۱۳۰۸ھ)، ادیب الہند مولانا فیض الحسن سہارنپوری (م ۱۳۰۴ھ)، مفتی ارشاد حسین رامپوری مجددی (م ۱۳۱۱ھ)، مولانا مفتی عبدالمجید فرنگی محلی لکھنوی (م ۱۳۴۰ھ) اور مولانا وکیل احمد حنفی سکندر پوری (م ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء۔ شاگرد خاص علامہ ابوالحسنات عبدالحئی لکھنوی) ایسے اجلہ علماء کی تائید حاصل تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان میں ایک بھی بریلوی یا بدایونی علماء کا شاگرد نہیں۔

گویا اہل سنت کے مابین مباحث میں اختلاف بریلی کے کسی عالم کی فکر کا شاخسانہ نہیں بلکہ علماء دیوبند کے کچھ تفردات اور زعم توحید میں شان رسالت کے حوالے سے تنقیص و سوء ادب پر مشتمل کچھ افکار تھے جس کی گرفت پہلے اور لوگوں نے کی۔ ہاں حسام الحرمین (۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۶ء) کے فتاویٰ سے بڑے پیمانے پر ردِّ دیوبند کا غلغلہ بلند ہوا۔ یہ بات بھی درست ہے کہ حسام کی تائید جہاں بہت سے علماء اہل سنت نے کی۔ (کم و بیش ۲۷۰ کے قریب علماء کی فہرست الصوارم الہندیہ میں مولانا حشمت علی لکھنوی نے دی ہے۔ یہ کتاب ۱۳۴۵ھ/ ۱۹۲۶ء میں طبع ہوئی) وہاں کئی اکابر مثلاً حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی، حضرت شاہ ابوالخیر دہلوی (شاگرد شاہ عبدالغنی مجددی)، خواجہ حسن جان سرہندی (شاگرد شیخ احمد بن زینی دحلان مکی و شیخ رحمۃ اللہ مہاجر مکی)، شیخ الاسلام مولانا انوار اللہ فاروقی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا مشتاق احمد چشتی انبیٹھوی اور علامہ معین الدین اجمیری ایسے علماء نے اگرچہ عبارات کو غلط، گستاخانہ اور کفریہ کہا تاہم تکفیر سے کفِّ لسان رکھا اور اسی کو احوط جانا۔ گو یہ وضاحت اپنی جگہ اہم ہے کہ حسام الحرمین کے فتاویٰ تکفیر کی حمایت نہ کرنے کے باوجود یہ اکابر علماء و مشائخ معتقدات و معمولات میں مولانا بریلوی سے کلی موافقت رکھتے ہیں۔ اور دیوبندی عقائد کے ہمنوا نہیں۔ فاضل بریلوی کے فتویٰ تکفیر کی عدم تائید کو دیوبندی عقائد و نظریات کی موافقت سے تعبیر کرنا صریحاً غلط اور دوراز کار تاویل کی قبیل سے ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ دیوبند کے عمومی حلقے تو کجا ان کے بڑے بڑے علماء بھی ان

شخصیات سے متعارف نہیں۔ حالانکہ دیوبندی مورخین نے اپنے مکتب فکر کے تمام فضلاء و رجال کار کے سوانحی خاکے بڑی دقت نظر سے قلمبند کیے ہیں۔ اگر کہیں اشتراک فکر ہوتا تو حلقہ دیوبند میں ان کا بھی بھرپور تعارف ہوتا۔

رد بریلویت کی وجوہات اور پس منظر

اس ساری بحث میں ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آج جس طرح بریلوی عقائد کو شرک و بدعت سے آلودہ قرار دیا جا رہا ہے اور مولانا احمد رضا کو ایک فرقہ کا بانی، تو کیا فی الواقع ایسا ہی ہے؟ نہیں بلکہ تاریخی حقائق کچھ اور ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ فاضل بریلوی نے تو علماء دیوبند کے خلاف فتوے دیے تاہم اکابرین دیوبند کی طرف سے کوئی فتویٰ ان کے (عقائد و معمولات کے) خلاف نہ تھا۔ بلکہ تاریخی حقیقت ہے کہ جب علامہ انور شاہ کشمیری سے مناظرہ بہاولپور کے دوران پوچھا گیا کہ آپ تو بریلوی علماء کی تکفیر کرتے ہیں تو انہوں نے باقاعدہ بیان قلمبند کروایا کہ وہ کسی صورت بریلویوں کی تکفیر نہیں کرتے۔ یہ عدالتی بیان ۱۳۵۰ھ کے لگ بھگ ہے جب فاضلِ بریلوی کے وصال (۱۳۴۰ھ) کو بھی دس گیارہ سال ہو چکے تھے۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ چند فروعی مسائل کے علاوہ تو کسی بات پر شرک و کفر کے فتویٰ کا مطلب اپنے اکابرین کو متہم کرنے کے مترادف تھا کیونکہ ارواح ثلاثہ، سوانح قاسمی اور اشرف السوانح جیسی کتب میں درج واقعات کسی طور بھی مروجہ سنی عقائد و معمولات سے ہٹ کر نہیں تھے۔ ہاں یہ درست ہے کہ حلقہ دیوبند میں بریلویوں کے خلاف شدت فاضل بریلوی کے تکفیری فتویٰ سے شروع ہوئی تاہم رد بریلویت پر جم کر کام فاضل بریلوی کی وفات کے بھی ۲۵، ۳۰ سال بعد ہوا۔ اس میں دو شخصیات کا کردار اہم ہے۔ ہندوستانی علماء میں مولانا منظور نعمانی چونکہ مناظرانہ ذوق اور طبیعت رکھتے تھے تو وہ کھل کر لکھنے لگے اور مناظرے کیے، اگرچہ آخری عمر میں انہوں نے معارف الحدیث ایسے علمی کاموں کی طرف توجہ دی۔ دوسری شخصیت مولانا سرفراز صفدر کی ہے۔

پاکستان میں بریلوی مکتبہ فکر کے خلاف اصل نفرت اور آواز مولانا حسین علی (واں بھچراں/تفسیر بلغۃ الحیران والے) کے ہاں سے اٹھی۔ ان کے شاگردوں نے اس میں کافی جوش دکھایا جس میں سرفہرست مولانا غلام اللہ خان، مولانا سرفراز صفدر اور مولانا ضیاء القاسمی وغیرہ تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس انداز فکر کا معروضی تجزیہ نہیں کیا گیا۔ ایک تو مولانا حسین علی صاحب بڑی متشدد اور تیز طبیعت کے آدمی تھے۔ اگرچہ خاندان نقشبندیہ مجددیہ موسیٰ زئی شریف کے مجاز تھے، تاہم صوفیاء کی روش کے برعکس مناظرہ جو طبیعت پائی تھی، لہٰذا مشائخ وصوفیاء بالخصوص چشتیہ نظامیہ (پاکستان میں کثرت ہے) سے بڑی کد تھی۔ اس دور میں پنجاب کے تمام بڑے علماء یا علمی گھرانے خانقاہ سیال شریف سے وابستہ تھے۔ ان چشتی مزاج علماء کے ساتھ جو کہ بریلوی نہ تھے، مولانا حسین علی کی نوک جھوک لگی رہتی۔ اندازہ کریں کہ حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی جیسے بزرگ صوفی اور عالم سے بھی موصوف مناظرہ کرنے سے باز نہ آئے۔ تو یہ وہ ذہن تھا جس نے سنی مشائخ اور علماء (پنجاب کے زیادہ علماء دار العلوم نعمانیہ لاہور کے فاضل تھے اور خیرآبادی منہج رکھتے، گو بگوی خاندان میں حدیث کا ذوق زیادہ تھا) کے خلاف ذہن سازی کی۔ مولانا بھچرانوی کے شاگردوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بعد میں دیوبندیوں میں مماتی فکر بھی اسی مولانا حسین علی کی فکر کا شاخسانہ تھی۔

مولانا حسین علی کی متشدد طبیعت کا شاہ عبدالقادر رائے پوری علیہ الرحمۃ جیسے بزرگوں کو بڑا احساس تھا۔ (حضرت کے 'ملفوظات' مرتبہ از مولانا محمد انوری اور 'حیات طیبہ' از صاحبزادہ محمد حسین انصاری تیمی للّٰہی دیکھیے) بلکہ خود مولانا حسین علی کے پیر بھائی اور بانی خانقاہ سراجیہ، مولانا ابوالسعد احمد خان علیہ الرحمۃ (جن کے علو مقام کے مولانا انور شاہ کشمیری اور علامہ شبیر احمد عثمانی جیسے بزرگ قائل تھے۔ دیکھیے کتاب "تحفہ سعدیہ") کو اس تکفیری اور متشدد طبیعت سے بڑی نفرت تھی۔ (دیکھیں 'حیات صدریہ'۔ سوانح قاضی صدرالدین نقشبندی) اب چونکہ پچاس/ ساٹھ کی دہائی میں پاکستان کے سنی علماء میں سے علماء دیوبند کے ساتھ بحث مباحثہ کے لیے جو علماء اٹھے وہ زیادہ تر بریلوی اور مرادآبادی سلسلہ کے لوگ تھے، لہٰذا فتویٰ بریلویوں پر لگنا شروع ہوا۔ حالانکہ خود سنی حلقوں میں فاضل بریلوی کی کتب کا تعارف اور پڑھنے کا ذوق کہیں بعد میں شروع ہوا، بلکہ بیشتر سنی علماء دیوبندیوں کی فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ کے خلاف سخت کلامی سے ہی متاثر ہو کر ادھر متوجہ ہوئے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ فاضل بریلوی پر جن دو شخصیات نے پاکستان میں سب سے پہلے علمی اور تحقیقی انداز میں کام کیا، وہ دونوں بریلوی نہ تھے نہ بریلوی علماء کے شاگرد۔ میری مراد ڈاکٹر مسعود احمد نقشبندی اور حکیم محمد موسیٰ امرتسری سے ہے۔ جیسے پہلے عرض کیا ہے، پنجاب کے سنی علماء کا تعارف بریلویوں سے زیادہ نہ تھا۔ یہاں تو علامہ فضل حق رامپوری (م ۱۹۴۰ء)، علامہ غلام محمد گھوٹوی (م ۱۹۴۰ء)، علامہ معین الدین اجمیری (م ۱۹۴۰ء)، مولانا مہر محمد اچھروی (م ۱۹۵۴ء) اور مولانا یار محمد بندیالوی (م ۱۹۴۷ء)، قاضی محمد دین بدھوی (م ۱۹۶۴ء) اور علامہ غلام محمود پپلانوی (م ۱۹۴۸ء) وغیرہ کے شاگرد زیادہ تھے اور یہ سب سنی تھے۔ بریلویوں سے کوئی بھی براہ راست نہ پڑھا تھا۔ تاہم جب مولانا حسین علی اور ان کے شاگردوں نے ان علماء کے شاگردوں سے مناظرے شروع کیے تو سارے غیر دیوبندی اب بریلویوں کی چھتری تلے جمع ہونا شروع ہو گئے جن میں مختلف مراکز علمی (رامپور، فرنگی محل لکھنو، کانپور، خیرآباد، دارالعلوم نعمانیہ لاہور، بدایوں اور بریلی کے) کے وابستگان تھے۔

اس پس منظر میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ بریلوی عقائد و معمولات کے بڑے حصے کو انیسویں اور بیسویں صدی کے علماء اہل سنت کے بڑے طبقے کی تائید رہی ہے۔ رہا حسام الحرمین کے بعد کے ادوار میں دیوبندی بریلوی شدید منافرت اور دونوں کے انداز و مزاج میں واضح فرق جس میں تطبیق کی کوئی صورت آج دینی مزاج کے لوگوں کے لیے ہضم کرنا مشکل ہے تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ علماء دیوبند نے علمی و تحقیقی اور درس و تدریس پر توجہ دی اور دینی مدارس کے فروغ اور دعوتی کام کی وجہ سے عوام کے بڑے طبقے کو متاثر کیا۔ یوں شعوری طور پر دینی ذوق رکھنے والے لوگ ان کے پاس آتے گئے۔ دوسری طرف بریلوی علماء مولانا حشمت علی لکھنوی، مولانا اجمل سنبھلی وغیرہ ہندوستان جبکہ پاکستان میں مولانا سردار احمد فیصل آبادی، مولانا عمر اچھروی اور مولانا ابوالبرکات وغیرہ نے اور ان کے شاگردوں نے "رد دیوبندیت" کو ہی موضوع بنایا اور ٹھوس علمی کام نہ کر سکے۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ جدید موضوعات تو کجا، روایتی خرافات و رسومات کے آگے بھی بند نہ باندھا جا سکا۔ مزید نقصان یہ ہوا کہ فاضل بریلوی، جنہوں نے رد بدعات

میں بہت کام کیا تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمعصر مشائخ وعلماء میں رد بدعات کے حوالے سے شاید ہی کسی نے اتنا کام کیا ہو، کی اصل فکر اور اصلاحی تعلیمات دب گئیں اور نیم خواندہ بریلوی مولوی نور وبشر کے موضوعات پر ہی تقریریں کر کے سنیت کا تعارف کروانے لگے۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ فاضل بریلوی کی اصلاحی تعلیمات کے فروغ میں رکاوٹ میں اہم کردار یہاں کے چشتی نظامی، چشتی صابری اور سہروردی اور قادری مشائخ کی خانقاہوں اور گدیوں کا بھی رہا۔ انہوں نے ان پڑھ مریدوں کو قابو میں رکھنے کے لیے ایک طرف تو دیوبندیوں کے خلاف ان کے حسام الحرمین کے فتاویٰ کو خوب اچھالا لیکن فاضل بریلوی کی اصل تعلیمات خاص کر رد بدعات کو سامنے ہی نہ آنے دیا۔ یوں علمی کم مائیگی، وعظ پسندی اور جہال کی خرافات وبدعات کو گویا بریلویت کے مترادف سمجھا جانے لگا۔

ماضی قریب میں بہت سارے اہل علم اپنے آپ کو اس رد دیوبندیت کی شدت پسند بریلویت سے نہیں جوڑتے۔ متاخرین میں شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی، مولانا محمد عالم آسی امرتسری، پیر کرم شاہ الازہری، خواجہ غلام سدید الدین مرولوی، مولانا محمد ذاکر بانی جامعہ محمدی شریف جھنگ، شاہ ابوالحسن زید فاروقی، شاہ وجیہ الدین احمد خاں رامپوری، خواجہ محمد عمر بیر بلوی، قاضی صدر الدین نقشبندی، علامہ حافظ ایوب دہلوی، علامہ جمال میاں فرنگی محلی، سید محمد ہاشم فاضل شمسی، علامہ حکیم محمود احمد برکاتی، پروفیسر مولانا شاہ منتخب الحق، ڈاکٹر فضل الرحمن انصاری، محدث دکن شاہ عبداللہ قادری، ڈاکٹر پیر محمد حسن، مولانا سعید احمد مجددی، علامہ علی احمد سندھیلوی اور سید نصیر الدین نصیر گیلانی ایسے کئی جید علماء ومشائخ نے خیر آبادی، فرنگی محلی اور خانوادہ اللہی سے منسوب سنیت کو ہی فروغ دیا ہے۔ ذرا دیکھیے، ذیل کے الفاظ میں کس دردمندی اور اخلاص کے ساتھ ایک بڑے سنی عالم نے اس طرف توجہ دلائی ہے:

> ''دین کے اصولی مسائل میں دونوں متفق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی توحید ذاتی اور صفاتی، حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی بسا اوقات رسالت اور ختم نبوت، قرآن کریم، قیامت اور دیگر ضروریات دین میں کلی موافقت ہے۔ لیکن طرز تحریر میں بیاحتیاطی اور انداز تقریر میں بے اعتدالی کے باعث غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور باہمی سوءِ ظن ان غلطیوں کو بھیانک شکل دے دیتا ہے۔ اگر تقریر وتحریر میں احتیاط واعتدال کا مسلک اختیار کیا جائے اور اس بدظنی کا قلع قمع کر دیا جائے تو اکثر وبیشتر مسائل میں اختلاف ختم ہو جائے۔ اور اگر چند امور میں اختلاف باقی رہ بھی جائے تو اس کی نوعیت ایسی نہیں ہوگی کہ دونوں فریق عصر حاضر کے سارے تقاضوں سے چشم پوشی کیے آستینیں چڑھائے، لٹھ لیے ایک دوسرے کی تکفیر میں عمریں برباد کرتے رہیں۔''

یہ آراء معروف سنی عالم اور صوفی حضرت پیر کرم شاہ صاحب الازہری کی ہیں جس کا اظہار ٹھیک پچاس برس قبل تفسیر ضیاء القرآن کے مقدمہ میں کیا۔ اس میں شک نہیں کہ باہمی تکفیر وتفسیق کے اس دور میں اس جرات مندانہ موقف اور امت کے اجتماعی مسائل کے لیے دلسوزی اور دردمندی کے جذبہ رفیعہ سے پیر صاحب اتحاد بین المسالک کی کوششوں میں اپنے معاصرین سے سبقت لے گئے۔ بعد کے ادوار میں مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی ایسے بزرگوں نے عملی کوششیں بھی کیں جو بوجوہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکیں۔ تاہم اس کا سنی حلقوں بڑا فائدہ یہ ہوا کہ فہیم وذی شعور

عناصر مذہبی مسائل میں ٹھیٹھ بریلویت اور دیوبندیت کی بجائے اہل سنت کی پرانی معتدل روش کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ پیر کرم شاہ سے کم وبیش بیس سال بعد ہندوستان میں رامپور، جو دیوبند و بریلی کے مدارس دینیہ سے پہلے کا مشہور دبستان علمی ہے، کے ایک نہایت قابل فرزند مولانا وجیہ الدین احمد خاں رامپوری نے "مسلک ارباب حق" لکھ کر یہاں احقاق حق اور ابطال باطل کا فریضہ سرانجام دیا اور طرفین کی درست باتوں کی تائید اور غلط عقائد و نظریات کا علمی رد کیا، وہیں اتحاد بین المسالک کی دعوت بھی دی۔ اس کتاب کی ثقاہت اور اہل علم وفضل کے ہاں وقعت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ معروف محقق ودانشور پروفیسر نثار احمد فاروقی (صدر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی) نے پیش لفظ لکھا۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''حضرت مولانا شاہ وجیہ الدین احمد خاں علیہ الرحمۃ نے دیوبندی اور بریلوی دونوں مدرسہ ہائے فکر کے بارے میں متوازن اور معتدل رائے کا اظہار کیا ہے۔ اور عام مسلمانوں کیلئے جو دین کی بنیادی کتابوں سے براہ راست اور گہری واقفیت نہیں رکھتے، یہی مسلک اعتدال مناسب ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ علمائے دیوبند کے بعض اکابر سے لغزشیں ہوئی ہیں• مولانا المولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے ان لغزشوں پر مدلل نکتہ چینیاں کی ہیں اور وقت نکتہ چینی وہ اکابر موجود تھے۔ لیکن اپنے اقوال کی تفسیریں اور تعبیریں انہوں نے بیان کی ہیں، قول سے رجوع نہیں کیا۔ کاش یہ دیوبندی اکابر اپنے اقوال سے رجوع کر لیتے تو آج ہندوستان کا بہت بڑا اختلاف مٹ جاتا۔ لیکن نہ اکابر نے رجوع کیا نہ اصاغر نے لغزش کا اقرار کیا۔ نتیجے میں دیوبندی بریلوی محاذ قائم ہوگیا۔ دوسری طرف بریلوی علماء کے بارے میں حضرت خطیب اعظم فرماتے ہیں کہ حضرات علمائے بریلی نے سخت تشدد اختیار کیا اور لغزشوں کے کرنے والوں کو ہی فقط کافر نہیں کہا بلکہ ان کے کفر میں جو شک کرے، اس کو بھی کافر کہا ہے۔ اس غلو آمیز عموم سے ہندوستان میں کوئی بھی مسلمان نہیں رہ سکتا''۔

سچی بات ہے کہ آج غیر جانبدار اور تحقیقی ذوق کے علماء اور مفکرین کی ضرورت ہے تاکہ ایک طرف عوامی مزاج کے لیے خاطر خواہ طریقے سے دینی تربیت کا اہتمام ہو سکے۔ اس کے لیے بریلوی فکر کی اہمیت سے انکار نہیں۔ نیز سلاسل تصوف اور بزرگوں کے عقائد و معمولات سے وابستہ افراد بھی ان سنی بریلویوں سے ہی قربت محسوس کرتے ہیں اور انہی سے ذوقی مناسبت کی وجہ سے فیض اٹھا سکتے ہیں جبکہ دوسری طرف وہ طبقات جو شرک و بدعت کے حوالے سے شاہ اسمٰعیل دہلوی اور ان کے اَتباع کی سی حساسیت رکھتے ہیں، علماء دیوبند کی دینی راہنمائی میں شرک و بدعت کے حوالے سے محتاط روی کو حرزِ جان بنا سکتے ہیں۔ جیسے بریلوی علماء کے لیے رد دیوبند سے بڑھ کر رد بدعات اور احیائے دین پر کام کرنا زیادہ ضروری ہے، وہاں پر دیوبندی علماء کو بھی اس فکر سے نکلنا ہوگا کہ امت کے ایک بڑے طبقہ کے معمولات گویا شرک سے آلودہ ہیں۔ نیز انہیں اپنے آپ کو یزیدی فکر کے فروغ اور خارجیت جدیدہ کے دست و بازو بننے سے رکنا ہوگا تاکہ دیوبندی بریلوی مسالک صحیح معنوں میں ذوقی چیز ہی رہیں نہ کہ تکفیر و تضلیل سے اپنا شیرازہ بکھیرتے رہیں۔ مسلک ذوقی ترجیح کی حد تک تو شاید قابل قبول ہو، لیکن اسے امت میں تشتت و افتراق کی دستاویز کسی